۸ جون ۱۹۷۰ء

ہفت روزہ

ہماری زبان

جلد ۲۹ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۲۲

اس شمارے میں

آل احمد سرور

میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟

جب سے میں واپس آیا ہوں جو سوال مجھ سے سب سے زیادہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ میں نے امریکہ کو کیسا پایا؟ دراصل امریکہ جانے سے پہلے میں امریکہ کے متعلق اپنے یہاں کے اخباروں سے، امریکی اخباروں اور رسالوں سے، وہاں کے ناولوں اور کہانیوں سے، وہاں کے دانشوروں کے مضامین سے، اچھا خاصا واقف تھا۔ پھر علی گڑھ اور دہلی میں امریکہ کے ہر طرح کے لوگوں سے ملاقات کر چکا ہوں۔ ان میں وہ پروفیسر بھی ہیں جو یہاں اپنے موضوع پر مواد حاصل کرنے آتے ہیں اور وہ نوجوان بھی جو دہلی اور لکھنؤ کی سڑکوں پر بال بڑھائے، میلے کپڑے پہنے گھومتے ہیں اور موقع ملے تو بھیک مانگنے میں بھی عار نہیں سمجھتے۔ میں نے جدید امریکی شاعری جدید امریکی ناول اور افسانے اور جدید امریکی تنقید کا جو مطالعہ کیا ہے اس سے امریکہ کے ذہن کے متعلق اور وہاں کے فنکاروں کی تخلیقی صلاحیت اور فنی شعور کے متعلق میری ایک سوچی سمجھی رائے ہے۔ اس لئے امریکہ جاکر، وہاں کچھ مہینے قیام کر کے وہاں کی ایک ممتاز یونیورسٹی میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے کر، وہاں کے کچھ اساتذہ سے مل کر، وہاں کے طلبہ کی زندگی کو دیکھ کر، وہاں کے کتب خانے، میوزیم، بازار، عمارتیں، سڑکوں کا ہجوم، ہوٹلوں میں رہنے والوں کی زندگی، ٹی۔ وی کے آئے دن کے انٹرویو اور مباحثے، جلسے، ریلیں، بسیں، ہوائی جہاز، کتابوں کی دکانیں اور کچھ شہروں کے قابل دید مقامات دیکھ کر نہ تو میری آنکھیں خیرہ ہوئیں نہ مجھے مایوسی ہوئی۔ میں نے جس امریکہ کے متعلق پڑھا اور سنا تھا اور یہاں پر امریکیوں سے مل کر جو نظریہ قائم کیا تھا وہ یکسر غلط نہ تھا۔ ہاں وہ تاثر دھندلا کچھ بے روح سا تھا۔ وہاں جاکر، لوگوں سے مل کر وہاں کی زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اب اس میں ایک آب و تاب ہے، ایک زندگی ہے، ایک گہرائی اور تنوع ہے جس کی وجہ سے میری نظر میں زیادہ بالیدگی آئی ہے یا ایک قیمتی تجربہ حاصل ہوا ہے۔ ساری دنیا کے ایک ہونے اور انسانوں کی برادری کی مشترک قدروں کا اور ثبوت ملا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مشرق و مغرب کی اصطلاحیں پرانے معنی میں غلط ہوتے ہوئے اب بھی کچھ معنویت رکھتی ہیں اور مغرب صرف علم اور دولت اور مشرق صرف جہالت و غربت کا نام نہیں بلکہ مشرق کی بعض قدروں کو مغرب اپنا سکتا ہے اور اپنا رہا ہے اور مغرب کی قدریں تو خیر بے سمجھے بوجھے ویسے ہی ہمارے مشرق میں اپنائی جا رہی ہیں۔ مگر ان میں سے بعض سطحی ہیں۔

ایلڈس ہکسلے نے ہندوستان کے سفرنامے میں کسی جگہ کہا ہے کہ ہندوستانی ہر جگہ سیاست کو گھسیٹ لاتے ہیں، سیاست سے مفر نہیں، افسوس یہ ہے کہ ہمارے یہاں سیاست کا مفہوم بہت سطحی ہے اور چند نعروں اور چند سیاسی ہینڈروں تک

اس کی پرواز ہے۔ ورنہ حقیقی سیاسی شعور تو ہر پڑھے لکھے انسان کے لئے ضروری ہے۔ ہمارے ملک کی سیاست کا تقاضا یہ ہے کہ ہمارے یہاں غریبی اور جہالت ختم ہو، سماج میں جو بے انصافی ہے وہ دور ہو، چند لوگوں کو تجوریاں بھرنے اور عوام کو مر مر کر جینے کے لئے نہ چھوڑ دیا جائے جدید دور نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے جو وسائل مہیا کئے ہیں ان سے کام لے کر پیداوار کے قدیم طریقوں کو بدلا جائے، غلّے کی پیداوار بڑھائی جائے، ملک میں صنعتوں کا جال پھیلایا جائے، آبادی کے خطرناک رفتار سے بڑھنے کو روکا جائے، فرقہ پرستی اور ذات پات کے تعصب کو دور کیا جائے، نوجوانوں کو جدید دور کے میلانات سے آگاہ کیا جائے، ان میں خود سوچنے اور خود کام کرنے کی لگن پیدا کی جائے، ان کی توانائی کو صحیح راستے پر لگایا جائے اور جو تبدیلی زندگی کا قانون ہے وہ اس طرح لائی جائے کہ تاریخ کا ایک جامع تصور، روایت کا ایک صالح تصور اور تہذیب کا ایک سائنسی تصور عام ہو سکے۔ مگر آزادی کے تیس برس کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ملک آگے تو بڑھا ہے، مگر اس کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی ہے اور ہمارے سیاست دانوں نے اقتدار کی ہوس میں ملک کے مفاد کو نظر انداز کر دیا ہے۔ پارٹی سب کچھ ہو گئی ہے، ملک کچھ بھی نہیں رہا۔ اپنا اپنا خطہ یا علاقہ سب کے ذہن میں ہے، ملک کے مفاد کا دھیان بہت کم لوگوں کو ہے۔ لوگ یا تو امریکہ کی طرف دیکھتے ہیں یا روس کی طرف یا چین کی طرف، اپنے من میں کوئی نہیں جھانکتا، لوگ فرقوں میں، ٹولیوں میں، محاذوں، ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یا امریکہ کے دوست بلکہ دست نگر ہیں یا روس کی نگاہیں دیکھتے ہیں یا چین کی طرف لو لگائے بیٹھے ہیں۔ اس لئے امریکہ کے دوست، امریکہ کو جنت ارضی سمجھتے ہیں، روس کے ہم نوا روس کو ایک مثالی ریاست اور چین کے پیرو چین کے عشق میں گاندھی جی کی تصویروں کی بے حرمتی کرنے سے نہیں چوکتے۔ حالانکہ امریکہ کے نظام کی خوبیوں کو مانتے ہوئے، روس کو دوست رکھتے ہوئے، چین سے ہمدردی کرتے ہوئے، ہندوستان سامنے رہنا چاہئے اور کسی کی نقالی یا کسی کے دامن دولت سے وابستگی کا بھول کر بھی خیال نہ کرنا چاہئے۔

ہمارے ملک میں طرفدار بہت ہیں سخن فہم کم۔ اس نے امریکہ کے متعلق عام تاثر دو طرح کا ہے۔ ایک جنت ارضی کا، دوسرا ایک جہنم کا۔ دونوں تصور سطحی ہیں امریکہ جنت بھی ہے اور جہنم بھی۔

(باقی آئندہ)

مشہور پاکستانی غزل خواں سلیم رضا نے مستقل طور پر ہند میں سکونت اختیار کر لی

نئی دہلی:- پاکستان کے مشہور غزل سرا سلیم رضا نے آخر کار ہندوستان کو اپنا وطن بنا لیا ہے اس ۳۵ سالہ مغنی نے ہندوستان میں لاکھوں لوگوں کو غزلیں سنا کر مسرت بخشی ہے۔ سلیم رضا نے پاکستان کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا ہے اور وہ ایک ہندوستانی شہری کی حیثیت سے ہندوستان میں آباد ہو گئے ہیں۔ یاد رہے پاکستان میں سلیم رضا کو محمد رفیع ثانی کہا جاتا تھا۔ • سیاست

صفحہ ۸ سے آگے

کہ مرنے والے سب قامت بدل کر زندہ رہتے ہیں ... ہم نور بن کر جاوداں پائندہ رہتے ہیں

جو بیٹے ہیں تو ہیں ماں باپ ہی کا خون کے چھینٹے ... ادھر ماں باپ بھی بیزار ہیں اولادِ ناکام سے

فاضل مرتب کا مضمون غالب شناسی۔ حسب اور اب، بہت تشنہ ہے۔ انھوں نے یہ تو واضح کر دیا کہ غالب کی ان کے زمانے میں خاصی قدر ہوئی مگر اس پر غور نہیں کیا کہ شروع سے کچھ غالب کے کہنے سے اور کچھ فارسی شاعری کی مقبولیت کی وجہ سے غالب کی فارسی شاعری کو زیادہ اہمیت دی گئی۔ کبھی کبھار فنکار اپنے فن کے معاملے میں دوراندیش نہیں ہوتا جس طرح کوئی باپ اپنے زیادہ لائق چھوٹے بیٹے کے مقابلے میں بڑے بیٹے کو زیادہ چاہتا ہے۔ زندگی میں یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جس لڑکی کو زیادہ بنا سنوار کر پیش کیا جائے یا جس کی اٹھتے بیٹھتے تعریف کی جائے اسی کی طرف لوگوں کی نظریں زیادہ پڑتی ہیں۔ فاضل مرتب نے غالب کے قدیم رنگ اور جدید رنگ کی جو تقسیم کی ہے اس سے بھی ہمیں غالب کی عظمت کو سمجھنے میں زیادہ مدد نہیں ملتی غالب کو سمجھنا ہے تو اس ہیرے کا تصور کیجئے جو کان سے نکالا گیا ہے اور جس میں ہیرے کے ساتھ پتھر بھی موجود ہیں، رفتہ رفتہ ہیرا پتھر سے الگ کر لیا جاتا ہے اور اسے تراشا جاتا ہے۔ یہ منتخب دیوان کا غالب ہے مگر پورے غالب کو سمجھنے کے لئے اس کے سارے کلام کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے غالب کا مشاہدہ و تجربہ جتنا گہرا ہوتا گیا اتنا ہی بقول رسکن اندر کا پیڑ نشو و نما پاتا رہا۔ اسی اندر کے پیڑ میں حقیقی غالب ملے گا۔

بحیثیت مجموعی عیارِ غالب ایک قابلِ قدر اور خیال انگیز مجموعہ ہے جس سے غالب کو سمجھنے اور پرکھنے میں یقیناً مدد ملے گی۔

•

ایک گذارش

جن خریداروں کے پتوں پر سرخ نشان ہے ان کو اطلاع دی جاتی ہے کہ ان کا چندہ ختم ہو گیا ہے۔ وہ جلد چندہ ارسال کریں۔

منیجر

مرزا سعید الظفر چغتائی

اقبال اور ان کی بیخودی کا مستقبل

فرد اور جماعت کے تعلقات کا مسئلہ جتنا اہم ہے، اتنا ہی مشکل بھی ہے۔ اس لئے تعجب کیوں ہو اگر فکر و فہم کی تاریخ میں ہمیشہ اس بارے میں سوچا گیا ہو اور ہمیشہ رایوں میں اختلاف رہا ہو۔ اقبال نے بھی اس سوال پر غور کیا ہے، اور جواب دئے ہیں۔

آج کے فرانس کا معروف عالم اور فلسفی ہنری لیفیور HENRI LEFEBVRE نے ایک جگہ بڑے زور و شور سے لکھا ہے کہ فلسفے تین اور صرف تین طرح کے ہوتے ہیں، عیسائی الٰہیات پر مشتمل، انفرادی اور اشتراکی۔ اگر پہلی صنف کو وسعت دے کر صرف "الٰہیات" کہا جائے تو بات زیادہ قابل فہم ہو جاتی ہے اور قول صرف یورپ اور امریکا تک محدود نہ رہ کر دوسری تہذیبوں پر بھی عاید ہو سکتا ہے۔ اقبال جیسے عالمی سطح پر سوچنے والے مفکر، آندرے ژید کے بقول اس لئے لکھتے ہیں کہ قاری انھیں پڑھ کے اس گھروندے سے باہر نکل آئے، جس میں وہ روایتاً، تہذیباً، عادتاً، مذہباً، عملاً اور فکراً رہتا چلا آیا ہو، حتیٰ کہ کتاب ختم کر کے اسے بھی پھینک دے اور کہے "مصنف، میں تیرے جال میں بھی نہیں پھنستا!"

کئے ہیں فاش رموز قلندری میں نے
کہ فکر مدرسہ و خانقاہ سے ہو آزاد

اس لئے اقبال کا تعلق ان تینوں فکری مدرسوں سے ہو جاتا ہے۔ اردو میں اقبال کے مذہبی افکار کا جائزہ کثرت سے لیا گیا ہے۔ قرآن اور محمد عربی کی شخصیت سے ان کا والہانہ لگاؤ شرح و بسط سے بیان کیا گیا ہے، مسلم مفکروں اور صوفیہ سے ان کے رشتے اجاگر کئے گئے ہیں، خصوصاً رومی سے ان کے روحانی استفادے محتاج تعارف نہیں۔ اینی میری شمل نے چند برس ہوئے اپنی کتاب انگریزی GABRIEL'S WINGS میں اقبال کے مذہبی افکار کا جائزہ "رموز بیخودی" کی بنیاد پر لیا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے منصور حلاج سے اقبال کے روحانی تعلقات کا جائزہ لیا ہے، جس میں لوئی میسینیوں LOUIS MASSIGNON کے اثرات نمایاں ہیں۔ وہ منصور جس نے انا الحق کہا اور سولی پائی اور وہ انا الحق جس کی اقبال نے اپنے فلسفۂ خودی کی روشنی میں نئی توجیہ کی۔ شمل تسلیم کرتی ہیں کہ اقبال نے اپنا ایک مکمل نظام فکر مرتب کر لیا تھا۔

دانش مندوں نے ہمیشہ قدما سے استفادہ کیا اور ان کی محنتوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اقبال نے شوپن ہاور SCHOPENHAUER سے استفادہ کرتے ہوئے "زور خودی" کو خلاق کائنات کہا۔ ان کے نزدیک زندگی خودی کا مظہر ہے، جس میں سخت کوشی سے جلا ہوتی ہے۔ یہ سخت کوشی کمال خودی کی تلاش سے پیدا ہوتی ہے۔ کمال خودی کا مظہر حسن ہے۔ حسن کی جستجو عشق ہے اور حسن آفرینی کو آرٹ کہتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کا آرٹسٹ مرد کامل ہے۔ لہٰذا ارتقائے خودی از خود ترقی یافتہ خودی کے نمونوں کے باہمی اتحاد و تعاون، محبت، یگانگت، بلکہ ادغام پر منتج ہوتی ہے۔ اس طرح از روئے فطرت، انفرادی خودیاں ترقی کی ایک منزل پر پہنچ کر ایک اجتماعی خودی کو وجود میں لاتی ہیں، جس کے سامنے انفرادی خودیاں ماند پڑ جاتی ہیں۔ یہ منفرد خودیاں فنا تو نہیں ہوتیں، لیکن وجود کے ایک بلند درجے پر فائق ہو جاتی ہیں، جہاں وہ ایک مجتمع خودی کے اندر جیتی اور اس کے سہارے وہ درجے طے کرتی ہیں، جو علاوہ ازیں ممکن نہ تھے۔ یہ عمل وسعت سب کے تعاون سے پیدا ہوتا ہے، کسی کے اکراہ سے نہیں۔ یہ خودیوں کا اثبات ہے، ان کی نفی نہیں، اور اصطلاحاً "بے خودی" کہلاتا ہے۔

اقبال اپنے نظام خودی کی تعمیر میں جمالیات اور انسان کامل کی سطح پر ہی روایتی فکر سے ممتاز ہو جاتے ہیں۔ لیکن بے خودی کا تصور دے کر وہ ان مفکروں کی صف میں نمایاں ہو جاتے ہیں، جنھوں نے ماضی سے لیا ہے اور مستقبل کو دے گئے ہیں۔

انفرادی اور اجتماعی تقاضوں میں مفاہمت کی کوششیں بارہا کی گئی ہیں، اقبال کی کاوش نہ اس ضمن میں تنہا ہے اور نہ پہلی۔ دور حاضر میں بعض وقت اشتراکیت اور سرمایہ داری کو علی الترتیب محض اجتماعی اور محض انفرادی نظاموں کا نمائندہ قرار دیا جاتا ہے۔ فرانس کی ۱۹۶۸ کی ناکام تحریک انقلاب میں ان دونوں کی متفاوت شکل کے ایک بار پھر سامنے آئی، تو صدر جنرل دے گول GENERAL DEGAULLE

1- Henri Lefebvre, "Le Marxisme" in The series "Que sais-je?" no. 300 published by Press Univ. de France (Paris, 1969).

2- Andre Gide, "Les Nourritures terrestres" Gallimard (Paris 1917)

۳ مثلاً اقبال اور عشق رسول ....

۴ مثلاً مضامین عشرت حسن انور مطبوعہ معارف ۵۵، ۱۹۵۰ء

5- Annemari Schimmel "Gabriel's Wing" Leiden (1963)

Annemari Schimmel, "Gabriel's Wing" Leiden (1963)

2. Louis Massignon "La passion d'al-Hallaj, martyr mystique de l'Islam" Paris (1922), Vol. I & II.

نے دونوں نظاموں کو انسانی نقطۂ نگاہ سے ناقص قرار دیتے ہوئے باہمی تعاون PARTICIPATION کی تجویز پیش کی اور جب حالات اس پر معتدل ہو جانے پر اس تجویز کا "استصواب" قوم نے استصواب میں رد کر دیا تو وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں اقبال کا حل زیادہ آفاقی بھی ہے اور زیادہ حسین بھی۔

تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وسیع تر وحدتوں کا تدریجی قیام پوری انسانی تہذیب میں برابر پیش ہوتا رہا ہے۔ انسانی برادری کی ساخت اس طرح عمل میں آئی ہے کہ افراد نے خاندان بنائے، خاندانوں نے مل کر بستیاں بسائیں، پھر یہ بستی تہذیبیں ریاستی نظاموں میں ضم ہوئیں۔ ریاستیں وسیع تر ہوئیں اور ہوتی جا رہی ہیں۔ سیاسی ہی نہیں، دوسرے انسانی اعمال و مظاہر بھی اس عمل سے متاثر ہوئے ہیں، مثلاً تہذیبیں، زبانیں اور ادبیات۔ لیکن محل غور یہ ہے کہ ہمیشہ ایسی کوششیں کامیاب نہیں ہوئیں۔ ترقی کی سمت ہمیشہ ایک نہیں رہی۔ اتار چڑھاؤ آتے رہے۔ وسعت سے ٹوٹ کر محدود وحدتیں قیام میں آتی رہیں اور اب بھی آجاتی ہیں۔ آخر یہ کیوں اور کیسے؟

تشریحی مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہی کوششیں حتمی طور پر کامیاب ہوئی ہیں جن میں ایک تہذیب دوسری پر حاوی نہیں ہوئی بلکہ تہذیبوں کے تعاون نے ایک گنگا جمنی بنائی ہے۔ جہاں ایک زبان دوسری زبان پر مسلط نہیں ہوئی، متعدد زبانوں نے مل کے ایک نئی زبان کو جنم دیا ہے۔ جہاں ایک وحدت دوسری وحدت کو نگل نہیں گئی، بلکہ جہاں وحدتوں نے اپنی خوبیاں یکجا کر کے ان پر نئے نظام کی بنیاد ڈالی ہے۔ یعنی جہاں اثبات خودی کے ساتھ بیخودی کا تجربہ ہو سکا، کامیاب رہا۔ جہاں نفی خودی کی کوشش کی گئی، کامیابی تلف وقتی رہی۔ یہ نتیجہ ایک طرف ان کمزور لیکن خوددار قوموں کے لئے حد درجہ ہمت افزا ہے، جو ظلم کے خلاف مقاومت کرتی ہیں، تو دوسری طرف زیادہ وسیع عالمی سطح پر ہونے حرکت و عمل کی رہنمائی کر سکتا ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ جیسی پیشین گوئی اقبال، ایچ۔ جی۔ ویلس وغیرہ صاحبان بصیرت نے کی تھی، وہ پوری ہو رہی ہے۔ پوری دنیائے انسانیت جاگ اٹھی ہے، اور اپنے مستقبل کی تعمیر میں لگی ہے۔ یہ عمل محدود سے لامحدود، قلیل سے کثیر اور وسیع سے وسیع تر کی طرف جانے پر ہی محمول ہو سکتا ہے۔ اقبال کے اصول بیخودی ایسے وقت ہر مرحلے پر ہمارے رہنما ہونے چاہییں۔

1- JENERAL CHARLES DE JAULLES
قوم کے نام فرانسیسی ریڈیو اور ٹیلیویژن پر نشریات۔ (1958-69)

"ہماری زبان"
سے خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں

ظفر صہبائی

غزل

پڑھو مجھے کہ میں ہوں حرفِ آگہی کی طرح
افق پہ وقت کے ابھرا ہوں روشنی کی طرح

تھکی تھکی سی، افسردہ، نڈھال، مفلس سی
یہ زندگی کہ ہے بیمار اس صدی کی طرح

کھلی جو نیند تو کیوں تیرگی ہے پیشِ نظر
ہمارے خواب تو اجلے تھے روشنی کی طرح

برنگِ درد ہوں لیکن دکھائی دیتا ہوں
میں بزمِ دہر میں رنگِ شگفتگی کی طرح

یہ کیسی فکر ہے، کیسا خیال، کس کی یاد
ظفر جو سوچ میں ڈوبے ہو فلسفی کی طرح

پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

اردو ۔ غیر جانبداری کے ساتھ

(ذیل کا پر مغز مقالہ ہندوستان کے مشہور ادیب و شاعر اور انگریزی کے ایک تسلیم شدہ اسکالر جناب رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے زیر نظر مقالہ میں اردو زبان کے بارے میں جہاں دلائل کے ساتھ کچھ تحقیقی اور معلوماتی حقائق پیش کئے گئے۔ وہیں دوسری طرف جدید ہندی پر ایک اجمالی مگر موثر اور کارگر تبصرہ کیا ہے۔ یہ مضمون ہندوستان ٹائمز سے ترجمہ کیا گیا ہے۔)

گذشتہ نصف صدی سے میں ایک بہی خواہ اور قدردان کی حیثیت سے جدید ہندی زبان کی نثر اور نظم کی نشوونما کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ اگرچہ مخلصانہ نکتہ چینی بھی کی ہے۔ میں اردو کا بھی ایسا ہی بہی خواہ اور ایک بے لاگ طالب علم ہوں۔ میری خواہش ہے کہ ہندی زبان ترقی کرے تاہم کیا آپ جانتے ہیں؟

کہ ہندی نثر اور نظم کے مقابلہ میں اردو نثر اپنی ابتدا سے آج تک عوامی زبان رہی ہے اور اردو نظم خواص میں مقبول رہی ہے۔

جدید ہندی ادب کے بالمقابل اردو ادب میں آپ کو ہزاروں کی تعداد میں زیادہ خالص ہندی الفاظ فقرے اور روزمرہ کے محاورے ملیں گے!

اردو نثر اور نظم میں آپ کو ایسی ہی سادگی جیسا خلقی حسن فصاحت اور عام عوامی سطح کی جیسی برج بھاشا اودھی، میادری اور بھوج پوری کے مشہور شاعروں کے کلام یا ہندی کے لوک گیتوں میں ملتی ہے؟

تلمیحات اور استعاروں کے معاملہ میں اردو شاعر جدید ہندی شاعروں سے بہت آگے ہیں۔ جو ان چیزوں سے یکسر خالی ہیں۔ ہندی کی آسان اور سادہ گنی چنی نظموں میں اردو زبان کی ہزاروں آسان خوب صورت موثر اور پرکیف نظموں کے مقابلہ میں ادبی، فنکارانہ قدروں اور غنائیت کا قطعی فقدان ہے۔ ایسی سادہ اور بے جان نظمیں جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں ایک ادبی زبان میں عامیانہ کہی جاسکتی ہیں اس لئے مقابلتاً آسان جدید ہندی شاعری کو جہاں تک آسان اور سادہ شاعری کا تعلق ہے، میرؔ، دردؔ، سوداؔ، نظیرؔ، آتشؔ، انیسؔ، داغؔ، حالیؔ، چکبستؔ اور دوسرے بہت سے اردو شاعروں کے کلام کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ان موخر الذکر شعراء کی سادگی میں شائستگی ہے۔

عوامی زبان ۔

ہماری نظموں کی زبان اس زبان کے مقابلہ میں ہندی کے آقاؤں کی طرف سے ٹھونسی جارہی ہے بول اور لکھی جانے والی اردو زبان سے بہت قریب ہے۔

عوام و خواص ڈھائی ہزار سے تین ہزار تک عربی اور فارسی کے الفاظ سمجھتے اور گفتگو میں استعمال کرتے ہیں لیکن عام استعمال میں آنے والے سنسکرت الفاظ کی تعداد زیادہ سے زیادہ تین سو سے چار سو تک پہنچتی ہے ان الفاظ میں سے تقریباً ہر ایک لفظ اردو فرہنگ کا جز بن گیا ہے۔

عام لوگوں میں عربی فارسی کے اس قدر الفاظ استعمال کرنے کا ایک سبب یہ ہے ہندی الفاظ کی طرح ۹۹ فیصدی فارسی اور عربی الفاظ صوتی اعتبار سے غیر تعرضی ہیں جبکہ تمام سنسکرت کے الفاظ کی اکثریت جو ہندی زبان میں در آمد کئے جارہے ہیں صوتی اعتبار سے بھدے اور بھاری ہوتے ہیں یعنی ہندی مزاج کے بالکل برعکس اور متضاد۔

برج بھاشا اور اودھی شعراء نے اور ہندی کی دوسری شکل کے شعراء نے سنسکرت کے تمام الفاظ کے استعمال سے گریز کیا تو بہت کم اور جب یہ سلسلہ ختم کردیا گیا اور سنسکرت کے الفاظوں کی بھرمار شروع ہوئی تو ہندی کا زوال شروع ہوگیا اور اس گھن نے ہندی کو موت سے ہم آغوش کردیا۔

اردو مشاعرے

ڈھاکہ، کلکتہ، چاٹگام، بنگلور، میسور، مدراس، کراچی، لاہور، چنڈی گڑھ، انبالہ، حیدرآباد، احمد آباد، پونا، بمبئی، پشاور، ناگپور، جے پور اور اجمیر جیسے ایک دوسرے سے دور دراز شہروں میں منعقد ہوتے رہتے ہیں صرف دہلی یوپی، بہار اور پنجاب میں ہی نہیں ہوتے ان کی بات کہنا ہی بے کار ہے۔ یہ اردو مشاعرے اب بھی ہزاروں سامعین اور قدردانوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

لیکن کوی سمیلن کی بابت آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ نے کبھی کوی سمیلن ریڈیو سیلون یا کہیں سے سنا ہے۔

ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کی شہرت اور عظمت میں شبہ کیا جاسکتا ہے، مگر میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، انیسؔ، اقبالؔ، اکبرؔ، محمد حسین آزادؔ، شبلیؔ، ابوالکلام آزادؔ، رتن ناتھ سرشارؔ، کشن نرائن درؔ، درگا سہائے سرورؔ اور چکبستؔ کی عوام میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ان کی شہرت اور عظمت مسلم ہے۔

اردو ادب میں بہت سی خواتین شاعرات ملیں گی جن میں کچھ بلند مرتبہ ہیں۔ اگر آپ جدید ہندی ادب میں اتنی ہی خواتین شاعرہ تلاش کریں گے تو آپ کی کوشش ضائع ہوجائے گی۔

ان چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نہایت صاف قابل یقین بات ہے کہ اردو ادب پچھلے سو برس کے ہندی ادب سے بہت برتر ہے جس کے چند حقائق مندرجہ ذیل ہیں۔

اگر کوئی شخص مشہور اردو شعراء کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ زمانہ جدید کے ہندی شعراء مثلاً میتھلی سرن گپتا، جے شنکر پرساد، نرالا، سمترانندن

جادیدی ورما اور ان کے جانشینوں سے کرے تو وہ مندرجہ حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا۔

میتھلی سرن گپتا، جے شنکر پرشاد، نرالا، سمترا نندن پنت دیوی ورما اور ان کے آج تک کے جانشینوں کے کلام کے مقابلہ میں مشہور اردو شاعروں کے کلام کی ادبی قدروں کا صحیح اندازہ لگانے کا ایک طریقہ اس قسم کی فہرست تیار کرنے سے ہوسکتا ہے۔

(الف) اردو اور ہندی کے شاعرانہ کلام میں نفاست، بے ساختگی، برجستگی، اثر آفرینی، غنائیت۔

(ب) شاعرانہ اعتبار سے ہندی کے موثر الفاظ، روزمرہ محاوروں کا دونوں گروپوں میں ہندی الفاظ کے موزوں استعمال پر غور کیا جانا چاہیے۔ میں کہوں گا کہ ہندی الفاظ کا جس برمحل اور باریک بینی کے ساتھ اردو شاعروں نے استعمال کیا ہے، کوئی جدید ہندی شاعر ان کو اس طرح استعمال نہیں کرسکا ہے۔

(ج) مفرد اور مرکب تراکیب کا دونوں گروپوں میں برجستہ استعمال۔

(د) دونوں زبانوں کے وہ اشعار جو لاکھوں افراد کو ازبر ہیں اور ضرب الامثال بن چکے ہیں۔

(ہ) دونوں زبانوں کے وہ اشعار اور محاورے جو عوام کی زبان ہیں جن میں دھڑکن بھی ہے، بے ساختہ پن اور شیرینی بھی۔

ہر طبقہ کی عورتوں، مردوں اور بچوں کی زبان زد ہیں۔

اردو زبان اس تمام دولت سے آراستہ ہے جو ہمیں شہری زندگی نے عطا کی ہیں۔ مثلاً فہم و ادراک کی تیزی، دماغی و ذہنی مستعدی، شوخی و رنگینی اور اس زندگی کی وسعت و عظمت لیکن اس کے مقابلہ میں ہندی شاعری و نثر ہمارے عوام کو سست قدم، بھدی، بے ڈول، بے فائدہ اور کسی جناتی آواز میں معلوم ہوتی ہے۔

ہمارے ملک کے لاکھوں وہ لوگ جن کو اردو کی تعلیم کبھی نہیں دی گئی جن کو صرف ہندی سکھائی گئی ہے اور جن کے دماغ میں ہندی ان کی مادری حیثیت سے بٹھا دی گئی ہے۔ وہ بہ نسبت ہندی کے اردو کے مشہور ادیب اور شاعروں کے نام سے زیادہ واقف ہیں۔ اب آپ فرمائیں گے کہ جناب یہ بات آپ شہروں کی بابت کہہ سکتے ہیں، دیہات کی بابت نہیں۔ بجا فرمایا آپ نے مگر آپ کے ہندوستان کے بیشتر دیہات اپنی مقامی بولی استعمال کرتے ہیں، وہ کھادی بولی نہیں جانتے اور ہندی و اردو کے ادیبوں اور شاعروں سے ناواقف ہیں۔ لیکن اگر آپ یوپی کے مغربی اضلاع اور دلی اور صوبہ پنجاب کے اطراف کا بغور مطالعہ کریں تو وہاں دیہاتی بھی اردو غزلیں نظمیں گاتے چلیں گے۔

لاکھوں آدمیوں کو ہندی "اردو" دیوناگری تعلیم دی جاتی ہے لیکن وہ دور جدید کی ہندی شاعری اور نثر سے نہ کچھ دلچسپی لیتے ہیں اور نہ اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں بار بار ان کے دل و دماغ اردو نثر و نظم کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔

اردو ادب کے اندر جو کچھ ہے وہ ہندوستان کے عالی دماغ لوگوں کی پیداوار ہے صرف عالی دماغ ہی نہیں بلکہ روشن دماغ جو دور جدید کی پیداوار ہیں عجیب بات ہندی ادب کو نصیب نہیں۔ عظیم اردو ادبا ہندوستان کی روشن دماغ عورتوں اور مردوں کے ساتھ ایک ذہنی رفاقت رکھتے ہیں۔ ایسا ہندی ادبا میں نہیں میں جانتا ہوں۔ اردو ادب کے مشہور ادیب و شاعر پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر رادھا کرشنن اور مسز وشنا مینن اور دوسرے عالی دماغ ہستیوں کے ساتھ سفر کرتے ہیں اور دلچسپ گفتگو کے ساتھ ساتھ رفاقت و محبت کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔

ہندی الفاظ کا استعمال۔

ہزاروں ہندی کے جملے فقرے اور انداز بیان کے ساتھ ساتھ کھڑی بولی کے قواعد و ضوابط کو اردو ادیبوں نے آراستہ و پیراستہ کیا۔ وہ لوگ جو ہندی جانتے ہیں اور بہت سے ادیبوں و شاعروں نے بھی ان جملوں اور فقروں کو استعمال کیا مگر اس پر عبور نہ حاصل کرسکے لیکن اس کے برخلاف اردو ادیبوں نے ان کو سمجھا بھی اور ان پر عبور بھی حاصل کیا۔

جب سے ملک آزاد ہوا ہے وہ لوگ جو اپنے کو ہندی پریمی سمجھتے ہیں اب سمجھ گئے ہیں کہ جہاں تک ہندی کی ترقی اور حوصلہ افزائی کا تعلق ہے اب انہیں کوئی شکایت نہیں رہی اور واقعی اردو کو وہ حق مقام ملنا چاہتے جس سے اس کو محروم رکھا گیا ہے اور اچانک ان کے سامنے یہ بات کھل کر آجائے گی جب ان کا خبط پورا ہو جائے گا تب ہندی نظم و نثر جس کو وہ چاہتے ہیں غیر شعوری طور پر اردو نظم و نثر ہوگی جس کے وہ آرزومند ہیں اور وہ چاہتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندی دیوناگری میں اردو نثر و نظم کی مقبولیت کی وجہ سے فروخت نہیں ہوگی اور ہندی کا بازار ٹھپ ہو جائے گا۔

(بشکریہ نقیب)

مراسلات

اظہارِ حقیقت

میں نے زبان اردو کی جو خدمت کی ہے کسی سے پوشیدہ نہیں مدت کے اعتبار سے اگر کہا جائے کہ میری تمام عمر اسی میں گزری تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ہاں ایک وقت تھا جب میں اردو کا مخالف تھا اور کچھ اوراق اس کے خلاف لکھے تھے اسے کم و بیش تیس سال ہوئے۔ اس کے بعد میرے خیالات نے پلٹا کھایا میں نے اس کے ادب کا مطالعہ شروع کیا مطالعہ کے ساتھ ساتھ اس زبان سے میری گرویدگی بڑھتی گئی ساتھ ہی ساتھ اس میں تالیف و تصنیف بھی شروع کردی۔ اب تک متعدد کتابیں قلم سے نکل چکی ہیں اہل بصیرت نے جن کی جی کھول کر داد دی ہے۔ افسوس ہے کہ بعض حضرات اس ادبی کائنات سے صرف وہ حصہ لے لیا ہے جو اردو کی مخالفت میں تھا مثلاً ایک رسالہ "اردو زبان پر ایک تحقیقاتی نظر" کیپٹن سوریہ پرتاپ حق پرست کا میری نظر سے گزرا۔ مجھے رسالہ پڑھ کر بڑی تکلیف ہوئی کیونکہ اس سے میری اردو دشمنی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ایک ہیجانی رو میں لکھا گیا تھا جو آئی اور نکل گئی اور جسے تیس سال یعنی ایک جگ ہوگیا اس کے بعد کا تمام زمانہ میری اردو کی خدمت سے روشن ہے دوسری بات یہ کہ اس میں کیپٹن سوریہ پرتاپ صاحب حق پرست نے بہت کچھ قطع و برید کی ہے جس کا انھوں نے اس کے دیباچے میں اعتراف کیا ہے۔ لہٰذا اس تحریر کے ذریعہ مجھے اعلان کرنا لازمی ہوگیا کہ اس رسالہ سے میرا کوئی تعلق نہیں۔

• جگر بریلوی ۵ رمئی ۱۹۷۰ء میرٹھ

پہاڑی زبان کے لئے اردو رسم الخط کا مطالبہ

ہماچل پردیش میں "پہاڑی بھاشا" کو الگ قومی زبان تسلیم کرانے کا مطالبہ کافی زور پکڑ چکا ہے۔ یہاں تک کہ ہماچل کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر پرمار نے یوم ہماچل کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے اس بات پر خاص زور دیا کہ: "پہاڑی بھاشا کو قومی زبان کی حیثیت دلانا اشد ضروری ہے"۔ الغرض آجکل پورے ہماچل پردیش کے اندر ہر طبقے اور ہر حلقے میں ہندی کی بجائے پہاڑی کو علاقائی زبان قرار دئے جانے کی سنجیدہ کوشش ہورہی ہے۔ علاقائی زبان کے ساتھ ہی پہاڑی کے لئے اس زبان کے رسم الخط کا مسئلہ بھی زیر بحث آرہا ہے۔ ایک وسیع حلقہ پہاڑی زبان کے لئے اردو رسم الخط اختیار کرنے پر زور دے رہا ہے۔ حال ہی میں سولن کے شری دھرم دیر درما کا ایک طویل خط اخبارات میں شائع ہوا ہے جس میں پہاڑی زبان کے لئے اردو رسم الخط کی موزونیت کے بعض اہم پہلو بیان کئے گئے ہیں۔ اس خط میں یہ بھی کہا گیا ہے :-

"...... کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ پہاڑی بھاشا دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے اور کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ سنسکرت ہی اس کا اصل روپ ہوسکتا ہے۔ لیکن عوام کی اکثریت چاہتی ہے کہ اگر اردو رسم الخط اختیار کیا جائے تو اس سے نہ صرف عوام الناس کو فائدہ اور سہولت ہوگی بلکہ اس طرح پہاڑی بھاشا کی نشو و نما میں آسانی اور اس زبان کو بھاری فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پہاڑی بھاشا میں ہزاروں الفاظ ایسے ہیں جو اس لشکری زبان (اردو) سے آئے ہیں۔ ہماچل راجپوتوں کی سرزمین ہے۔ ان راجپوتوں کا تعلق شروع سے فرج کے ساتھ رہا ہے جو اکثر مسلم راج اور خصوصاً لشکری بھاشا کا ان پر بھاری اثر پڑا ہے۔ خوش قسمتی سے اردو زبان اور اس کا رسم الخط ہماچل کے مختلف حصّوں میں ابھی تک چالو ہے۔ کنّور اور لاہول سپتی کے دور دراز علاقوں میں بھی اردو رسم الخط چلتا ہے لہٰذا پہاڑی زبان کے لئے اردو رسم الخط نہایت مفید اور موزوں ہوگا۔ نہ صرف یہ کہ پہاڑی بھاشا کے لئے فوراً اردو رسم الخط اختیار کرلینا چاہئے۔ بلکہ پہاڑی بھاشا کی تمام تر تخلیق اردو رسم الخط میں ہی کی جائے۔

چنڈی گڑھ • سورج تنویر

انجمن کی خبریں

راجستھان میں اردو ادب اور ادیبوں کی ترقی و فلاح کے لئے جدوجہد

جے پور۔ ۲۹ مئی۔ انجمن ترقی اردو راجستھان کے دفتر واقع تسلیم منزل جے پور پر۔ انجمن کی ایک خصوصی میٹنگ سری جنار دھن رائے ناگر پریذیڈنٹ راجستھان ساہتیہ اکیڈمی اودے پور کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ جن کے ساتھ راجستھان کے مشہور کوی مانج شرمی ہرناتھ نے بھی شرکت کی۔

حاضرین میں انجمن کے ارکان کے علاوہ شہر کے مختلف الخیال معززین اور اردو دوست اصحاب بھی بڑی تعداد میں تھے۔

اول انجمن کے جنرل سکریٹری الحاج مولوی احترام الدین احمد شاغل نے جو عرصہ دراز سے علالت کے باعث نشست و برخاست تک سے آجکل قاصر ہیں۔ مگر خدمت اردو کے بے پناہ جذبے کی قوت کے باعث اس حالت میں شریک ہوئے تھے معزز مہمان کو خوش آمدید کہا اور ان کا تعارف کراتے ہوئے ان کی اردو ادب دوستی اور ان کی ترقیاتی اسکیموں اور پچھلی کامیابیوں کی تفصیل سے حاضرین کو باخبر کیا اور بتایا کہ اکیڈمی کے مقاصد میں ہندی۔ اردو۔ سنسکرت اور راجستھانی کی ترقی اور ان کے ادب کا فروغ شامل ہے۔ پہلے جب آپ اکیڈمی کے صدر تھے تو ہر چہار زبان کے لئے مساویانہ سلوک ہوتا تھا۔ مگر گذشتہ چند سال سے جبکہ آپ اس عہدہ پر نہ تھے اردو کے ساتھ جو سلوک اس ادارے نے کیا وہ لائق اظہار نہیں۔ گورنمنٹ راجستھان اور خاص کر چیف منسٹر راجستھان قابل شکرگزاری ہیں کہ انھوں نے سری ناگر جیسے وسیع الخیال اور صاف دماغ ہستی کو اس عہدہ پر سرفراز کیا۔

شاغل صاحب کی تقریر کے بعد سری ناگر نے اپنی تقریر میں نہایت صفائی سے ادب اردو کی ترقی اور ادبار کی فلاح و بہبودی کی ان اسکیموں اور جدوجہد سے مطلع کیا جو انھوں نے اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد شروع کر دی ہیں اور سب زبانوں کو قرار داد ہائے جدید کے مطابق ادبی لحاظ سے ترقی کے مواقع بہم پہنچائے ہیں۔

سری ناگر کی پرخلوص و صاف تقریر سے حاضرین بے حد متاثر ہوئے اور بتایا گیا کہ راجستھان کے تمام ادیب اور شاعر آپ کے ساتھ اور آپ کے ہمنوا ہیں۔

اس کے بعد جناب محمد رضا علی خاں صاحب جنرل سکریٹری جمعیۃ العلمائے راجستھان نے چند بنیادی سوالات متعلق تعلیم اردو کئے جس کا موصوف نے امید افزا جواب دیا اور ان سوالات کی اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان مسائل کو حل کرنے کا یقین دلایا اسی طرح نواب محمد عبدالباقی خاں صاحب صدر انجمن ہذا اور جناب پروفیسر عثمانی اور پروفیسر پی۔ کے مجاز اور ایڈیٹر صاحب "بشارت" کے استفسار کا بھی حوصلہ افزا جواب دیا اور اپنی امکانی امداد اور کوشش کا یقین دلایا۔

آخر میں اکیڈمی اور انجمن کے باہمی تعاون سے ایک "بزم ادبائے راجستھان" جس کو اکیڈمی کی زبان میں "اردو ساہتیہ کار پریشد" کہا جائے گا۔ انجمن ترقی اردو راجستھان کی نگرانی میں قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کے مصارف کا ذمہ اکیڈمی نے لیا۔ اس بزم کے مقاصد میں اردو ادب کی ترقی و ترویج اور غیر مطبوعہ قدیم و جدید ادبی تخلیقات کی طباعت و اشاعت بھی شامل ہوگی اور موجودہ ادبا کی فلاح و بہبود بھی۔ اس بزم میں راجستھان کے تمام ادیب و شاعر حسب قاعدہ شریک ہو سکتے ہیں۔ اپنے مقصد کے لحاظ سے یہ ایک شان ادارہ ہوگا۔

یہ میٹنگ تقریباً دو گھنٹے جاری رہ کر نہایت خوشگوار فضا میں شرکائے نشست کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ختم ہوئی۔

• نامہ نگار

دلی میں نصاب کی اردو کتابوں کی فراہمی اور بچوں کے داخلوں کے متعلق انجمن کی سرگرمیاں

دلی میں نصاب کی اردو کتابوں کی فراہمی اور بچوں کے داخلوں کے سلسلہ میں انجمن ترقی اردو دہلی کا ایک وفد محکمۂ تعلیم کے جوائنٹ ڈائریکٹر جناب دانچو سے ملا۔

اس گفتگو میں محکمۂ تعلیم کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر (ایجوکیشن پلاننگ) بھی شریک تھے۔ انجمن نے اپنی یادداشت میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ اردو ذریعۂ تعلیم کے اسکولوں میں ضرورتوں کو پورا کرنا محکمۂ تعلیم کی ذمہ داری ہے اور ان ضروریات میں اردو کتابوں کی فراہمی بھی شامل ہے۔

جناب دانچو صاحب نے اس سے اتفاق کیا لیکن اس سلسلہ میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر نے کتابوں کی اشاعت کے بارے پالیسی پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اردو کتابوں کا مسئلہ دوسری چودہ زبانوں میں کتابیں شائع کرنے کے مسئلہ سے جڑا ہوا ہے۔ علاوہ ازیں اردو کتابوں کی اشاعت غیر منافع بخش ہے اور مرکزی حکومت نے سائنس وغیرہ جیسے موضوعات پر ابھی اصطلاحات بھی طے نہیں کی ہیں۔ وفد کے اراکین نے زور دے کر کہا کہ اردو کتابوں کی فراہمی کی راہ میں یہ پالیسی حائل نہیں ہونی چاہئے۔ جہاں تک اصطلاحات کا تعلق ہے محکمۂ تعلیم کی طرف سے اس سے قبل تراجم کراتے وقت اصطلاحات کو فراہم کیا گیا تھا۔

اب بھی انھیں سے کام لیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ سائنس جیسے موضوعات کی کتابوں میں انگریزی یا ہندی کی اصطلاحات

بھی ساتھ ساتھ درج کی جا سکتی ہیں۔ وفد نے اس سلسلہ میں کتابوں کے ترجموں کی فراہمی اور ان کی اشاعت میں مدد کی پیش کش کی۔ جس کو اصولی طور پر اس شرط پر مان لیا گیا کہ مسودات کو محکمہ تعلیم منظور کرے گا۔ مختلف کلاسوں میں داخلوں کے بارے میں مذکورہ افسران نے کہا کہ وہ پرائمری اور مڈل اسکولوں سے پاس ہونے والے طلبہ کی تعداد معلوم کریں گے اور اس کی بنیاد پر ان کے داخلوں کا انتظام کریں گے۔

اس سلسلہ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر صاحب نے انجمن سے امداد اور تعاون کے لئے کہا۔ انجمن کے وفد نے اس سلسلہ میں پوری پوری امداد اور تعاون کا یقین دلایا۔

جناب دانجو صاحب نے اس مطالبہ کو بھی مانا کہ اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں سے اردو نہ جاننے والے اساتذہ کو واپس بلایا جائے۔ وفد نے زور دیا کہ اس وقت جبکہ نئے اسکولوں کے لئے تقررات ہو رہے ہیں ان کو آسانی کے ساتھ ہٹایا جا سکتا ہے۔ لیکن جوائنٹ ڈائرکٹر صاحب نے اس سلسلہ میں اردو اساتذہ کی کمی کا تذکرہ کیا۔ وفد نے اس بات پر اصرار کیا اور کہا کہ اساتذہ کی کمی نہیں ہے اور انجمن اس سلسلہ میں بھی تعاون کے لئے تیار ہے تاہم مذکورہ افسران نے اس سلسلہ میں پالیسی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ دفتر روزگار سے نام منگائے جاتے ہیں انھوں نے بعض ایسے کیسوں کا بھی تذکرہ کیا جس میں بعض خاتون اساتذہ اردو اسکولوں سے منتقلی کے لئے کوشاں ہیں۔ اراکین وفد نے کہا کہ یہ ان کا ذاتی معاملہ ہے۔ دفتر روزگاری میں اردو ٹیچروں کے نام بھی درج ہیں لیکن ان کے ناموں کو منگانے کے سلسلہ میں ایڈمنسٹریشن نے جو پالیسی اختیار کی ہے وہ دلی والوں کے لئے منصفانہ نہیں ہے۔ کیونکہ اس پر عمل درآمد کی صورت میں دلی والوں کی حق تلفی ہو سکتی ہے۔ تفصیل کے ساتھ مختلف مسائل پر گفتگو کے بعد طے ہوا کہ اس گفتگو سے جو نتائج نکلے ہیں انجمن کی طرف سے ان پر مشتمل ایک اور یادداشت تیار کر کے دی جائے تاکہ محکمہ تعلیم باقاعدہ ان کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکے۔

انجمن کے وفد کے اراکین یہ ہیں جنھوں نے یادداشت پیش کی اور بعد کو گفتگو میں حصہ لیا۔ محمد یوسف صاحب، سلیمان صابر صاحب، عظیم سیفی، ظفر ادیب صاحب آنرس سکریٹری انجمن، اور بہار برنی صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو دلی اسٹیٹ شامل تھے۔

معلوم ہوا ہے کہ انجمن کا وفد فیصلے کے مطابق جمعہ کے روز اس گفتگو کی روشنی میں ایک یادداشت پیش کرے گا۔ ۲۰ مئی کی صبح کو انجمن کا ایک وفد اردو اساتذہ کے مسئلہ پر گفتگو کرنے کے لئے جناب ویج کمار ملہوترا صاحب چیف ایگزیکٹو کونسلر سے بھی ملا۔

• الجمعیۃ

چیف ایگزیکٹو کونسلر سے انجمن ترقی اردو صوبہ دلی کے وفد کی ملاقات

نئی دہلی:۔ انجمن ترقی اردو صوبہ دلی کے ایک وفد نے چیف ایگزیکٹو کونسلر مسٹر ویج کمار ملہوترہ کو اس میمورنڈم کی ایک کاپی پیش کی جو اس سے قبل ڈائرکٹر ایجوکیشن کو پیش کیا جا چکا ہے اور جس میں راجدھانی میں اردو کے طلبہ کو پیش آنے والی مشکلات کی طرف ذمہ داروں کو توجہ دلائی گئی ہے۔ وفد میں جناب بہار برنی، ماسٹر محمد یوسف، جناب ناز انصاری، ظفر ادیب صاحب اور محمد سلیمان صاحب شامل تھے۔

چیف ایگزیکٹو کونسلر سے اردو طلبہ کے دیگر مسائل پر بھی تفصیلی گفتگو ہوئی جس کو انھوں نے توجہ سے سنا اور ان پر ہمدردانہ طور پر غور کرنے کا وعدہ فرمایا۔ ان میں طلبہ کے لئے اردو کتب کی فراہمی اور اردو اسکولوں میں صرف اردو جاننے والے ٹیچروں کی تقرری کے مسائل خاص طور پر شامل تھے۔

جس فارمولے کے تحت ٹیچروں یا لیڈی ٹیچروں کی تقرریاں عمل میں آرہی ہیں وہ بھی زیر بحث آیا اور وفد کے ممبروں نے اس فارمولے کے تحت دلی والوں کے ساتھ بے انصافی ہونے کا خدشہ ظاہر کیا لیکن جناب ملہوترا نے کہا کہ تقرریوں میں دلی والوں کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔

اردو ذریعہ تعلیم کے اسکولوں میں صرف اردو جاننے والے اساتذہ کی تقرری کے اصول کو آپ نے تسلیم کیا اور اردو کتب کے سلسلہ میں اس بات پر آمادگی ظاہر کی کہ اگر کوئی ادارہ یا پبلیشر ان کتابوں کو چھاپنے کی خواہش کرے گا تو اسے یہ اجازت دیدی جائے گی لیکن تراجم تصدیق کرانے ہوں گے۔ یہ ان کتابوں کے علاوہ ہوں گی جنھیں حکومت خود چھاپے گی۔

یہ ملاقات تقریباً نصف گھنٹہ جاری رہی جس کے دوران اردو اسکولوں اور اساتذہ اور اردو طلبہ کے مسائل سے متعلق بہت سی مفید باتیں سامنے آئیں انجمن ترقی اردو اس سلسلہ میں اپنی مساعی کو جاری رکھے گی اور اسے توقع ہے کہ راجدھانی میں اردو سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کی ان مساعی میں اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔

• الجمعیۃ

"ہماری زبان"

کے مضامین و مراسلات ارسال کرتے وقت یہ ملحوظ رہے کہ وہ کاغذ کے ایک طرف صاف لکھے ہوں۔

(ادارہ)

اخبار و افکار

جامعات کے اردو اساتذہ کے ریفریشر کورس کا خطبۂ استقبالیہ

(گورکھپور یونیورسٹی میں یونیورسٹی اور ڈگری کالج کی سطح کے اردو اساتذہ کا ۲۱ روزہ ریفریشر کورس ۲۲ مئی ۱۹۸۰ء کو شروع ہوا۔ اس موقع پر ڈاکٹر محمود الہٰی صدر شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی و ڈائرکٹر ریفریشر کورس نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اور کورس کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتے ہوئے جو خطبہ پڑھا تھا۔ اس کے اہم اجزا پیش کئے جارہے ہیں۔)

(افتتاحیہ جلسے کی صدارت ڈاکٹر اے ایس نبرجی صدر شعبۂ سنسکرت گورکھپور یونیورسٹی نے کی۔ افتتاح ریورنڈ کینن پی ای چانڈہ وائس چانسلر نے کیا)

حضرات! یونی ورسٹیوں کے اردو اساتذہ کے لئے "سمر اسکول" یا "ریفریشر" کورس کا اہتمام ایک نئی بات ہے، جب اس کا اعلان ہوا تو عام طور پر مسرت کا اظہار کیا گیا اور دانشوروں کی نگاہ اس کے افادی پہلو تک پہنچ گئی لیکن اس سے ہمیں مطمئن نہیں ہو جانا چاہئے اصل چیز یہ ہے کہ ہم سے جو توقعات وابستہ کی گئی ہیں ہم انھیں پورا کریں۔

ہمارے ملک میں تعلیم کی اہمیت ہر دور میں محسوس کی گئی مگر آزادی کے بعد ہمیں پہلی بار یہ موقع ملا کہ ہم اس کا رشتہ براہ راست سماج سے جوڑ سکیں اور اسے ملکی و قومی ترقیات کا ایک اہم جزو بنا سکیں۔ آج کے دور میں ہمیں اس تعلیم کی ضرورت نہیں جو ہمیں اپنے نہاں خانوں سے باہر نہ نکلنے دے اور ملکی و قومی مسائل کو حل کرنے میں مدد نہ دے سکے۔ اب ہم تعلیم کو سماج کے دوسرے شعبوں سے الگ کرکے نہیں رکھ سکتے۔ اگر ہمیں علم کو زندہ رکھنا ہے تو نہ صرف اسے مزید فعال بنانا پڑے گا بلکہ ملک و قوم کی قیادت کا بار بھی اسے سر لینا ہوگا۔ تعلیم کے سلسلے میں زبان کی ذمہ داری اور بھی زیادہ ہے۔ یہی ہمیں قدرت اظہار عطا کرتی ہے اور اسی کے بل بوتے پر ہم علمی خزانوں کا لین دین کرتے ہیں۔ اس طرح زبان کی تعلیم کے مسائل کا جائزہ لیتے رہنا ہمارے بنیادی فرائض میں داخل ہے۔ اور آج ہم اردو زبان کے اساتذہ اسی فرض کو ادا کرنے کی غرض سے پہلا قدم اٹھا رہے ہیں۔

اس بات کا ذکر کرتے کرتے ہم تھک سے گئے ہیں کہ اردو کا معیار گرتا جا رہا ہے۔ اسی پستی معیار کو ہمارے موضوعات گفتگو میں نمایاں جگہ ملتی ہے۔ کلاسوں میں جب طلبہ سے ہمیں پالا پڑتا ہے تو کبھی ان سے اور کبھی خود سے دست و گریباں ہونے کو جی چاہتا ہے۔ امتحان کی کاپیاں دیکھنے کے بعد ہم ایک آہ سرد بھرتے ہیں اور معیار کی گراوٹ پر دو آنسو بہا لیتے ہیں لیکن ہم میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ اس سوال پر غور کیا ہو کہ کیا ہم نے اپنے نصاب اور اپنے طریقۂ تعلیم کو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر لیا ہے اور "شامت اعمال" یا "خوبی تقدیر" سے قطع نظر کیا اس پستی معیار کی ذمہ داری کچھ ہم پر بھی عائد ہوتی ہے۔

ہمیں کہنا چاہئے کہ یونیورسٹیوں میں اردو تعلیم کی شمولیت کے وقت سے تاحال ہم نے اردو کے امتحانات کی سمت و رفتار میں راستے کے نشیب و فراز کو دیکھتے ہوئے اصلاح نہیں کی۔ اسی طرح ہم نے اپنے نصاب میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی۔ نصاب کے سلسلے میں ہم جلسے کرتے رہتے ہیں لیکن ہم سے اکثر اس کے علاوہ اور کچھ نہ ہو سکا کہ روایتی سانچے میں کبھی الف کے انتخاب نثر و نظم کی جگہ ب کے انتخاب نثر و نظم کو جگہ دے دی اور ب کے انتخاب کو نکال کر ج کا انتخاب اس میں ڈھال دیا۔

بات کچھ ایسی معلوم ہوتی ہے کہ جو طلبہ پری یونی ورسٹی یا بی۔ اے میں اردو کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے لیتے ہیں، ہم ان سب کو محقق، نقاد یا اردو کا استاد بنانا چاہتے ہیں۔ ہم انھیں جو پڑھاتے ہیں اور جس نہج سے ان کا امتحان لیتے ہیں اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ ہم ان کی دلچسپیوں اور باوقار زندگی گزارنے کے سلسلے میں ان کی ترجیحات کو ذہن میں نہیں رکھتے۔ ہم انھیں مختلف موضوعات پر بات کرنے کا ڈھنگ سکھانے کے بجائے انھیں غالب و اقبال جیسا شاعر یا میر امن اور رجب علی بیگ سرور جیسا نثر نگار بننے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ اردو بڑھ چڑھ کر زندگی کی دوڑ میں حصہ لے تو ہمیں موجودہ نصاب اور موجودہ طریقۂ تدریس کو بدلنا ہوگا۔

ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا ہوگا کہ بی۔اے کی سطح تک اردو پڑھنے والے طلبہ شعر و ادب کے علاوہ جو مفید مشاغل ہیں ان سے بھی وابستہ ہوتے ہیں۔ اردو ہر جگہ ان کا ساتھ دے سکتی ہے۔ یہ ذمہ داری ہماری ہے کہ ہم انھیں ساتھ دینے اور ساتھ رکھنے کا سلیقہ سکھائیں!

اب یونین پبلک سروس کمیشن نے مقابلے کے امتحانات کے بعض پرچوں کو اردو میں حل کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اسی طرح ہمارے ملک میں دوسری زبانوں سے علوم و فنون کی مستند کتابوں کے ترجمے کا کام منظم طور پر شروع ہو گیا ہے، اردو کو ترجمے کے باب میں پیچھے نہیں رہنا چاہئے اس لئے اب اس سے زیادہ مناسب وقت کب آئے گا کہ ہم اپنے نصاب کے ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی کریں گے۔

آپ کے سامنے ایک اور حقیقت کا اعادہ کرنا ضروری ہے ابتدائی اور ثانوی سطح پر اردو تعلیم کی کیفیت و کمیت سے آپ اچھی طرح آگاہ ہیں۔ یونی ورسٹیوں میں اردو تعلیم کی جو سہولتیں فراہم ہیں، ان کا عشر عشیر بھی ابتدائی اور ثانوی سطح کو میسر نہیں گویا اردو تعلیم نے آسمان کی بلندیوں کو تو چھو لیا ہے لیکن سطح زمین سے اس کا رشتہ منقطع ہوتا جا رہا ہے۔ اردو کی اس "خلائی پرواز" کا ایک نتیجہ یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ تعلیم و تربیت کے لئے وہ طلبہ ہمارے سپرد ہوتے ہیں جو دیوار دبستان پر لام الف بھی نہیں لکھ پاتے ایسے حالات میں معیار تعلیم پست نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ آپ مجھے یہ کہنے کی بھی اجازت دیجئے کہ خامیوں کو دور کرنا اور معیار کو متوازن رکھنا بہرحال ہم اساتذہ کی ذمہ داری ہے۔ حالات نے ہماری ذمہ داریوں میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہمیں اسے قبول کرنا چاہئے۔ ہمیں اپنے طریقۂ تدریس میں اتنی لچک پیدا کرنا چاہئے کہ اعلیٰ تعلیم کا معیار بھی قائم ہے اور ابتدائی و ثانوی سطح کی خامیاں بھی دور ہو جائیں۔

میں اس وقت آپ کے سامنے نصاب کا کوئی نیا قالب نہیں پیش کر رہا ہوں۔ میں طریقۂ تدریس کے نئے اصول بھی نہیں وضع کر رہا ہوں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ جن مسائل کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور جو دوسرے مسائل ریفریشر کورس کے دوران زیر بحث آئیں گے، آپ بھی ان پر بے روک ٹوک اپنی رائے کا اظہار کریں۔

• ڈاکٹر محمود الٰہی

(باقی صفحہ ۱۲ سے آگے)

کیا یہ بات واضح نہیں کہ مجموعی طور پر اس زبان کی وجہ سے غالب ان تخیلی و فکری تصویروں میں رنگ بھر سکے جو غالب کی اردو شاعری کو دین ہیں۔ بلاشبہ غالب نے جب حدیث دلبری کو صحیفۂ کائنات بنایا تو ان کے لئے فارسی سے مدد لینی ناگزیر تھی، ابتدائی کلام میں نقش کہیں کہیں بھدا ہے مگر آئینہ پر صیقل کے بعد اس پر جلا ہو گئی ہے۔ آج ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں فارسی سے مدد لینا لازمی طور پر مذموم نہیں اور ہندی سے مدد لینا لازمی طور پر مفید نہیں بلکہ موضوع اور فکر و فن کی ضروریات اور شخصیت کی افتاد کے مطابق، اپنے سارے کلاسیکل سرمائے سے جس میں فارسی و عربی کے علاوہ سنسکرت بھی شامل ہے، حسب موقع اور حسب ضرورت مدد لینا جائز ہی نہیں مفید بھی ہے غالب نے اگر فارسی سے مدد لی تو یہ ان کے لئے ضروری تھا اور اس کی افادیت ان کے کلام کی عظمت سے ظاہر ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ محض ان کی تقلید میں فارسیت اختیار کرنا اکوئی دانش مندی نہ ہوگی۔

محمد عزیز حسن مراد آبادی نے غالب کے تصور ویرانی پر خوبی سے روشنی ڈالی ہے، مگر انگریزی شعرا میں پوپ کی مثال بیان زیادہ مفید نہیں ہے غالب کی ویرانی کا تصور پوپ کے تصور سے گہرا ہے، اس میں ایلیٹ کے خرابے کا اولین نقش ہے۔

ڈاکٹر نریندر ناتھ وگ نے غالب ایک نفسیاتی مطالعہ کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ انھوں نے غالب کی شخصیت کو (MANIC DEPRESSIVE) کہا ہے۔ ان کے نزدیک غالب کے طبعی موڈ جوار بھاٹے کی طرح بدلتے تھے۔ اس رد و بدل میں بیرونی حالات کو کچھ زیادہ دخل نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ زیادہ تر ان کی اندرونی کیفیات کی وجہ سے ہوتا تھا۔ لے اس میں کلام ہے کہ یہ سب کچھ اندرونی کیفیات کا مدوجزر ہے۔ غالب کا مطالعہ تحلیل نفسی کے اس مکتب خیال کے مطابق جو فرائڈ سے منسوب ہے، ابھی تک غور سے نہیں کیا گیا۔ ڈاکٹر نریندر ناتھ وگ کا مضمون اس لحاظ سے مفید ہے کہ انھوں نے غالب کی غیر محفوظیت اور عبد الصمد کے (FATHER IMAGE) کی طرف اشارہ کیا ہے، مگر میرے خیال میں غالب کی شخصیت کو (MANIC DEPRESSIVE) قرار دینے میں انھوں نے جلدی کی ہے۔ ہاں فرائڈ اور ینگ کے نظریات کے مطابق غالب کا تفصیلی مطالعہ یقیناً غالب کی شخصیت کو سمجھنے میں اور معاون ہوگا۔ گوئٹے کا اس طرح کا مطالعہ ہمارے لئے نمونے کا کام دے سکتا ہے۔ ڈاکٹر عبد الجلیل نے غالب کی بیماریوں اور مرض الموت کے متعلق اپنی تحقیق صاف اور واضح انداز میں پیش کی ہے۔

چراغ دیر کا اردو ترجمہ شامل کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ غالب کی سبک اور مترنم بحر کے بجائے ترجمے میں جو بحر لی گئی ہے وہ جذبے کو پھیلا کر ہلکا کر دیتی ہے۔ اس میں ایسے مصرعے یا اشعار، شعریت سے خالی نظر آتے ہیں۔

نکالا مجھ کو دل سے یوں اسیری قسمت نے
بنایا بے سروساماں مجھے سامانِ وحشت نے

(باقی صفحہ ۲ پر)

تبصرہ

آل احمد سرور

عیارِ غالب

مرتبہ: مالک رام

ناشر: علمی مجلس دہلی

صفحات: ۲۷۲

قیمت: ۷ روپے ۵۰ پیسے

غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر جو کتابیں اور رسالے شائع ہوئے ان میں عیارِ غالب یقیناً قابلِ ذکر ہے۔ یہ دراصل رسالہ تحریر دہلی کا خاص غالب نمبر ہے جسے تحریر کے خاص شمارے کی جگہ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ مرتب نے اپنے پیش لفظ میں یہ واضح کر دیا ہے کہ اس مجموعے میں جتنے مضامین شامل ہیں وہ خاص اس کے لیے لکھے گئے ہیں۔ شروع میں تقویمِ غالب کے نام سے مرتب نے غالب کی زندگی کے خاص خاص واقعات تاریخی ترتیب سے درج کر دیے ہیں اور اس سلسلے میں جدید ترین معلومات سے کام لیا ہے لیکن صفحہ ۸ پر یہ اندراج کہ ۱۸۰۷، ۱۸۰۸ (تقریباً)۔ شعر گوئی کا آغاز، اسد تخلص، جسے چند سال بعد اسے بدل کر غالب رکھ لیا، غلط فہمی کا باعث ہو سکتا ہے خصوصاً اس لیے کہ ذیلی نوٹ میں لکھا ہے کہ انھوں نے اسد تخلص ترک کر کے اس کی جگہ غالب کر لیا۔ اکبر علی خاں نے غالب کا جو اولین دستیاب شدہ عکسی دیوان چھاپا ہے اس میں اسد کی جگہ جا بجا غالب بنایا گیا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب نے ۱۸۱۶ کے لگ بھگ تخلص غالب اختیار کیا ہو گا گو اسد تخلص کو یکسر ترک نہیں کیا۔

مرتب کا یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "غدا بجز" کو بنیاد بنا کر تاریخ ولادت متعین کرنا کسی طرح بھی درست نہیں ہے۔ عرشی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں پھر بھی ۸ رجنوری ۱۷۹۸ء پر اصرار کیا ہے۔ ضرورت تھی کہ اس اہم مسئلے پر بھی مرتب مزید اظہار خیال فرماتے۔ دراصل ڈاکٹر حمید اللہ کے ایک فاضلانہ مضمون سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ تقویم ہجری عیسوی کی اب تک کی ساری کوششیں ناقص ہیں اس لیے اس مسئلے پر کسی ماہرِ فن کی خصوصی توجہ کی ضرورت ہے۔

مجموعے میں غالب کی اردو شاعری کے چند پہلو کے عنوان سے فراق گورکھپوری کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ ہے۔ اس مضمون میں کچھ خیال انگیز باتیں کہی گئی ہیں، مگر ترجمہ کہیں کہیں واضح نہیں ہے۔ مثلاً سر ہنری نیوبولٹ کا ایک قول درج ہے "شاعری کا جوہر اس کا امتیاز ہے"۔ یہاں امتیاز سے کیا مراد ہے؟ کیا یہ کتابت کی غلطی ہے۔ فراق کا یہ تجزیہ صحیح ہے کہ غالب کے سینے میں بچے کا معصوم دل تھا اور سر میں دانا فلسفی کا دماغ، لیکن یہ نامکمل رہے۔ معصوم بچے اور دانا فلسفی کے درمیان ایک لذت پسند اور سخت کوش، اور رنج و راحت کو سمجھ سکنے والا نوجوان بھی موجود ہے اور غالب انھیں تینوں پہلوؤں سے عبارت ہے۔

ڈاکٹر محمد حسن نے اپنے مضمون میں غالب کے فن پر روشنی ڈالی ہے لیکن انھوں نے غالب کی اس میزان پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا ہے جو غالب نے اپنے ایک خط میں بیان کی تھی۔ ان خطوں میں کوئی مستقل معیار نہیں تھا۔ دوسرے خطوں میں دوسرے معیاروں کی طرف اشارے موجود ہیں۔ مثلاً سہل ممتنع کی طرف۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ معیار بھی غالب کے نزدیک قابل غور تھا۔ دراصل غالب کے فن کی روح تک پہنچنے کے لیے غالب کے کچھ بہترین اشعار کا تجزیہ کر کے یا ہر دور کے نمائندہ اشعار کا تجزیہ کر کے، یا نقادوں نے عام طور پر جن اشعار کو اہمیت دی ہے ان کو ذہن میں رکھ کر، ایک معیار اخذ کیا جاتا اور اس کا موازنہ غالب کے بیان کیے ہوئے معیاروں سے کیا جاتا تو بہتر ہوتا۔ پھر بھی یہ مضمون غالب کے فن کی کئی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور یقیناً مفید ہے۔ جدید تنقید میں فن کو بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ اس کے معنی فکر کو نظر انداز کرنے یا اس کے سماجی و تہذیبی پہلوؤں سے چشم پوشی کرنے کے نہیں ہیں بلکہ فکر کے فن بننے پر زور دینے اور دونوں کی وحدت پر اصرار کرنے کے ہیں اور غالب کے فن کے مطالعے میں اس لیے بنیادی حیثیت ان کی امیجری، تشبیہات و استعارات، مخصوص ایمائی زبان، تہ دار اور پہلو دار الفاظ کی ہے۔

پروفیسر ضیاء احمد نے اپنے مخصوص انداز میں غالب کے اس نعتیہ کلام کا جائزہ لیا ہے جو فارسی میں ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ غالب کے اردو کلام میں نعت نہیں ملتی لیکن بعض شارحین نے ان اشعار میں نعتیہ رنگ تلاش کیا ہے۔

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدم بوس کس لیے | کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں
رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ | رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

اگر پروفیسر ضیاء احمد غالب کی نعت اور منقبت کا موازنہ کرتے تو شاید یہ دلچسپ حقیقت سامنے آتی کہ ان کی منقبت ان کی نعت سے زیادہ زوردار ہے۔

قاضی عبدالودود اور پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مضامین تحقیق کے اچھے نمونے ہیں۔

مرتب نے غالب کی صحیح تاریخ ولادت کے متعلق سید محمد حسین رضوی کے مضمون کی اہمیت پر بجا زور دیا ہے جیسا کہ مرتب نے لکھا ہے اس کی تمہید میں بہت سی ہیئتی معلومات جمع کر دی گئی ہیں جو عام قاری کی دسترس سے باہر تھیں۔

ڈاکٹر گیان چند نے اپنے مضمون "زبانِ غالب" میں غالب کی مرکب تراشی، بعض فارسی مصادر اور حروف کے اردو میں بے تکلف استعمال، عربی فارسی کے فقرہ نما مرکب، توالیِ اضافت، توصیفی مرکبات کا استعمال اور فارسی محاوروں کے استعمال پر روشنی ڈالی ہے۔ گیان چند جیسے بالغ نظر سے امید تھی کہ وہ ان اسباب پر بھی غور کرتے جن کی وجہ سے غالب کو زبان اردو میں رنگ فارسی کی نمود کی بڑی

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم۔اے نے لیتھو کلر پرنٹرس علی گڑھ میں چھپایا اور دفتر مرکزی ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا

REGD. NO. فون نمبر ۲۹